اجتہاد تاریخ کی روشنی میں

ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام زندگی کا ایک ہمہ گیر اور جامع تصور دیتا ہے۔ یہ محض چند عبادات و رسوم کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل نظام زندگی اور ضابطۂ حیات ہے، جو زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی کرتا ہے اور ایسے جامع اُصول دیتا ہے جو ہر زمانہ اور ہر دَور کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، مادی ضروریات اور روحانی و اخلاقی ضروریات ہر دو کو۔ اسلام انسان کی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک سیاسی معاشی اور معاشرتی تصور دیتا ہے، جس کی بنیاد پر صالح معاشرہ اور متوازن سوسائٹی ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اسلام انسان کے روحانی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے عبادات اور انسان اور خدا کے درمیانی تعلق کو مستحکم کرنے کے لئے "مذہب" کا ایسا انقلابی تصور دیتا ہے، جو انسان کی پوری شعوری زندگی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور انسان کو دیگر تمام اطاعتوں سے نکال کر صرف خدائے واحد کی بندگی اور غلامی میں دے دیتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:۔

ان الحکم الا اللہ امر الا تعبدوا الا ایاہ ذلک الدین القیم ہ

حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرو یہی صحیح طریقہ ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر حاکمیت اور قانون سازی کے جملہ اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کرتے ہوئے انسانوں کو اسی کے قانون کی پیروی اور بندگی کی دعوت دی گئی ہے۔ اسلام اپنے ہر پیرو سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اگر تم نے اسلام کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے تو اس میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ صرف صبغۃ اللہ کو اختیار کر دو اور بقیہ تمام اطاعتوں کو باطل قرار دے دو۔

یا ایھا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان۔ (۲ - ۲۰۸)

اے اہلِ ایمان اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔

انبیاء کرام کی بعثت کا اصل مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کریں۔ یہاں پر قیامِ عدل اور مساوات کی کوشش کریں اور ظلم و فساد کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ہ (۵۷ - ۲۵)

ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے ہیں اور ان کے ساتھ کتاب (قانونِ حیات) اور میزانِ عدل اُتاری ہے تاکہ انسانوں پر انصاف قائم کریں۔

اسلام نے قیامِ عدل اور تحفظِ نوعِ انسانی کے لئے جو ھدایات اور اُصول ہم کو دیئے ہیں، ان کے پیچھے عظیم حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اسلام نے اپنی تعلیمات کی بنیاد عقل اور غور و فکر پر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ تفقہ فی الدین کے ذریعے اپنے رب کو پہچانیں۔

اسلام نے ہمیں جو تصور قانون دیا ہے۔ اس کی بنیاد دو اہم ماخذوں پر ہے۔ یہ ماخذ قرآنِ حکیم اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسلامی فقہ دراصل انہی اصولوں کے جاننے، ان میں غور و فکر کرنے اور ان سے تخریجِ مسائل کا نام ہے۔ چوں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔ اس لئے قرآن کا اسلوبِ بیان انتہائی مجمل رکھا گیا۔ اور اسے ہر زمانے میں قابل اور مستند بنانے کے لئے غیر ضروری تفاصیل سے احتراز کیا گیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں صحابہ کو جن مسائل سے سابقہ پڑتا، ان کے بارے میں یا تو وحی الٰہی کے ذریعے ھدایت کر دی جاتی۔ یا حضورؐ کی سنت سے سند لی جاتی۔ چوں کہ اُس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس صحابہ کے درمیان موجود تھے، اس لئے تخریجِ مسائل میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ البتہ نبی کریمؐ نے اپنے صحابہ میں دین کے بارے میں غور و فکر کرنے اور مسائل استنباط کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ چناں چہ جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا والی بنا کر بھیجا گیا تو آپؐ نے ان سے بعض سوالات کیے جنہیں معاذ بن جبلؓ نے خود یوں بیان کیا ہے۔

" جب تمہارے پاس کوئی معاملہ فیصلہ کے لئے پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے ؟ میں نے عرض کیا کہ میں اس کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہ ملے تو کیا کرو گے ؟ میں نے کہا اس کا فیصلہ رسول اللہؐ کی سنت کے مطابق

کروں گا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: اگر رسول اللہؐ کی سنت میں بھی اس کے متعلق کوئی بات نہ ملے تو کیا کروگے؟ میں نے کہا۔ پھر میں اجتہاد کر کے رائے متعین کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور اس میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھوں گا۔ رسول اللہؐ نے میری بات سُنی تو میرے سینے پر خوشی سے ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے نمائندے کو اس بات کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد کو کتنا پسند فرماتے تھے۔ اور اپنے عمّال اور صحابہ میں اجتہادی جذبہ پیدا کرنے کی کتنی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے دینی مسائل میں غور و فکر کرنے اور اجتہاد کی بنیاد پر اختلاف رکھنے کو اُمت کے لئے رحمت قرار دیا۔ کیوں کہ اس طرح اُمت کو دینی احکامات پر عمل کرنے میں آسانی اور سہولت ہو جاتی ہے۔ جو شخص جس مسلک کو اپنے لئے اچھا سمجھتا ہے، بلا روک ٹوک اس پر عمل کرتا ہے۔

اجتہاد کا مادہ 'ج ہ د' ہے۔ لغوی طور پر اجتہاد کے معنی انتہائی کوشش کرنے کے ہیں۔ فقہ کی خاص اصطلاح کے طور پر ہم جو معنی اجتہاد کے لیتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ قرآن و حدیث میں واضح حکم کے موجود نہ ہونے کی صورت میں انہی دو ماخذوں کی مدد سے تخریج مسائل کرنا اور احکام میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ گو اسلام نے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رکھا ہے۔ اور ہر زمانے میں اُمت نے اجتہاد سے کام لے کر اپنے لئے آسانیاں اور عمل کی راہیں پیدا کی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر کس و ناکس کو اجتہاد کرنے کا حق نہ دیا جائے۔ کیوں کہ اگر اُمت کا ہر فرد مجتہد بن بیٹھے گا تو احکام الٰہی میں من مانی تاویلات و تحریفات کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے مجتہدین کے لئے چند خصوصیات کو لازمی قرار دیا ہے۔ چناں چہ شاہ ولی اللہ مجتہد کے لئے پانچ خصوصیات کو بنیاد قرار دیتے ہیں:

اوّل ــــ وہ کتاب و سنت کے ان حصوں پر جن کا تعلق احکام سے ہے گہری نظر رکھتا ہو۔ اور یہ بھی جانتا ہو کہ ان کے اندر کون سے نصوص خاص ہیں اور کون سے عام۔ کون نص مجمل ہے اور کون مبین۔ کون حکم ناسخ ہے اور کون منسوخ۔

دوم ــــ (روایتی حیثیت سے) احادیث کے متعلق یہ علم رکھتا ہو کہ کون کون سی حدیثیں متواتر ہیں اور کون سی احاد۔ کون سی حدیث متصل ہے اور کون مرسل۔ نیز یہ کہ کون راوی کس درجہ میں قوی یا ضعیف ہے۔

سوم —— زبان عربی پر لغوی اور نحوی دونوں حیثیتوں سے پورا عبور رکھتا ہو۔

چہارم — علمائے صحابہ و تابعین وغیرہم کے اقوال کے بارے میں یہ خبر رکھتا ہو کہ کون مسئلے اجماعی ہیں اور کون اختلافی۔

پنجم —— قیاس کی حقیقت اور اس کی تمام اقسام کو جانتا ہے۔

ان خصوصیات سے متصف عالم ہی اس بات کا مجاز ہے کہ وہ ان مسائل میں جن میں قرآن وسنت خاموش ہوں، غور و فکر کر کے کوئی حل تجویز کرے۔ ایسے عالم دین کو فقہ کی اصطلاح میں "مجتہد مطلق" کہتے ہیں۔

اجتہاد اور مجتہدین کی خصوصیات کے اس مختصر جائزہ سے یہ بات متعین ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ ہر زمانے میں کھلا رہا ہے۔ خواہ یہ اجتہاد مستقل نوعیت کا ہو۔ یا اس کی حیثیت اجتہاد فی المذہب یا اجتہاد فی المسائل کی رہی ہو۔

قرآن وسنت میں اگرچہ اصول و کلیات کے علاوہ سینکڑوں جزوی مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ تمدن اور اجتماع کی ترقی اور مختلف اقوام کے ساتھ ربط پیدا ہونے کے نتیجہ میں بے شمار مسائل ایسے پیدا ہوئے جن کا کوئی واضح حل قرآن و حدیث میں موجود نہ تھا۔ ایسے تمام مسائل کو اجتہاد کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کی گئی، جیسا کہ اس سے پہلے حدیث معاذ بن جبل میں ذکر کیا گیا۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقِ استنباط کی توثیق فرمائی۔ آں حضرتؐ کے بعد خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیقؓ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتا تو آپ فیصلے کے لئے قرآن کو بنظر غائر دیکھتے۔ اگر وہاں کوئی ھدایت موجود ہوتی تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس معاملہ کے متعلق کوئی حدیث ان کے اپنے علم میں ہوتی تو اس حدیث کو اپنے فیصلہ کی بنیاد قرار دیتے۔ لیکن جب اپنا ذخیرہ حدیث بھی اس معاملہ میں رہنمائی نہ کر پاتا تو اس وقت آپ باہر تشریف لاتے اور عام مسلمانوں سے پوچھتے کہ کیا ان کو حضور نبی کریمؐ کا کوئی فیصلہ اس سلسلہ میں معلوم ہے۔ اگر پھر بھی کوئی حدیث نبویؐ نہ ملتی تو صحابہ سے مشورہ کرتے اور جس رائے پر اتفاق ہوتا، اُس کو اختیار کرتے۔ اس عمل کا نام "اجماع" ہے۔ اور یہ اجتہاد کی کامل ترین شکل ہے۔ بعض مواقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خود بھی اجتہاد فرمایا۔ چناں چہ جب آپ سے کلالہ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اگر صواب ہوا

تو اللہ کی طرف سے ہوگا ورنہ شیطان کی طرف سے۔ دوسرے موقع پر جب مانعینِ زکوٰۃ کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اکثر صحابہ اکرام کی مخالفت یا خاموشی کے باوجود ذاتی اجتہاد سے کام لیا اور زکوٰۃ کی فرضیت کو صلوٰۃ کی فرضیت کے برابر قرار دے کر جو حکم منکرِ صلوٰۃ کے لیے تھا، اسی کو مانعینِ زکوٰۃ کے لیے قرار دیا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مالک بن نویرہ کے واقعہ میں حضرت خالد کی طرف سے خون بہا ادا کیا۔ اور اس کی بنیاد ایک دوسرے واقعہ میں تلاش کی جب کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کے ایسا ہی کرنے پر خون بہا ادا کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے اجتہادوں میں ایک بہت اہم اجتہاد فدک کی زمین کے بارے میں ہے۔ خیبر کی فتح کے بعد نبی کریمؐ نے خیبر کو ۳۶ حصوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے ۱۸ حصے اپنے لیے بحیثیت صدرِ مملکت مخصوص کیے، جن کی آمدنی حکومت کے اخراجات اور اہلِ بیتِ نبویؐ پر خرچ ہوتی تھی۔ اور باقی حصص مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے۔ اہلِ فدک نے بغیر لڑے بھڑے صلح کی درخواست کی اور نصف زمین معاہدہ میں دینی منظور کی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمالیا۔ اور یہ زمین آپؐ کی ملکیت قرار پائی۔ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ و حضرت عباسؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس زمین کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ چوں کہ یہ زمین "خالصہ" رسول تھی۔ یعنی اس کی حیثیت ایک سربراہِ مملکت کے "خالصہ" کی تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کے اس ارشاد کی روشنی میں ۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کھلاتا ہے لیکن جب وہ اس کو دنیا سے اُٹھا لیتا ہے تو جو اُس نبی کا حصہ ہوتا ہے، وہ اُس شخص کی تحویل میں چلا جاتا ہے جو اس کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ اجتہاد فرمایا کہ فدک و خیبر کی زمینیں حضورؐ کے خلیفہ کا حق ہیں۔ لہٰذا اس پر دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ کے اجتہاد سے جزوی اختلاف تھا۔ یعنی وہ یہ تو تسلیم کرتے تھے کہ وراثت کے طور پر فدک و خیبر اُن کا حق نہیں ہے لیکن چوں کہ فدک و خیبر کی آمدنی بنو ہاشم کے غربا میں تقسیم ہوتی تھی، اس لیے اس کی تولیت وہ اپنے پاس رکھنی چاہتے تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بعد میں ان علاقوں کی تولیت و نگرانی ان حضرات کے حوالے کر دی مگر مصارف وہی رہے جو حضورؐ کے زمانے میں تھے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کے اجتہادات کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خمس مالِ غنیمت کے مصارف میں اجتہاد کے ذریعہ تبدیلی کی۔ حضور نبی کریمؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا۔ حقیقت یہ نہیں ہے۔ دراصل یہ غلط فہمی امام ابو یوسف کے ایک روایت نقل کرنے سے پیدا ہوئی ہے، جس میں وہ

کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خمس میں سے رسول اللہؐ اور ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط کر دیا اور صرف تین حصے باقی رکھے، حالاں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خمس کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کیا [1] اور جس طرح پہلے حضرت علیؓ اس کی تقسیم کیا کرتے تھے، اسی طرح ان کو دیتے رہے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:۔

"میں خمس آں حضرتؐ کی حیات میں تقسیم کرتا تھا۔ اس لئے ابوبکر صدیقؓ نے بھی مجھ کو اس کا متولی بنا دیا اور ان کی زندگی میں بھی خمس میں ہی تقسیم کرتا تھا۔" [2]

ابوعبید نے کتاب الاموال میں ابن شہاب الزہری کا ایک قول نقل کیا ہے۔ "ابوبکر صدیقؓ خمس کو اسی طرح تقسیم کرتے تھے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔" [3]

مزید یہ کہ ابویوسف کی اس روایت کا راوی محمد بن السائب الکلبی ہے جس کے بارے میں محدثین کا قول ہے کہ جھوٹا ہے۔ سبائی ہے [4] وغیرہ وغیرہ۔

اس مبحث کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خمس کے بارے میں یہ کہنا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اجتہاد کر کے اس کے مصارف میں تخفیف کر دی صحیح نہیں ہے۔ البتہ فئے کی اس جاگیر کے بارے میں جو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے مخصوص کر لی تھی اور جس کے بارے میں حضرت عباسؓ و حضرت فاطمہؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اجتہاد سے کام لے کر ایک فیصلہ کیا جس کا ذکر ہم اس سے قبل تفصیل سے کر چکے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے بھی اس اجتہادی جذبہ اور روح کو زندہ رکھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ایک رسالہ میں حضرت عمرؓ کے اجتہادات کو بیان کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ہر زمانے میں اجتہاد پر کاربند رہے۔ دورِ نبویؐ میں بھی آپ کے بعض اجتہادات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن ابی مشہور منافق کی نماز جنازہ پڑھنے پر حضرت عمرؓ نے اجتہاد کے ذریعے حضورؐ کو روکنے کی کوشش کی۔ امہات المومنین کے بارے میں حضرت عمرؓ نے اپنے اجتہاد کے ذریعے پردہ کرنے

---

[1] کتاب الخراج از ابویوسف ص ۲۴ [2] کتاب الخراج ص ۲۰ [3] کتاب الاموال ص ۳۳۱۔

[4] میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ حافظ ذہبی ج ۳ ص ۱۶۹۹۔

اور بازار میں نہ نکلنے کا مشورہ دیا، جس کی توثیق بعد میں قرآن کے ارشاد سے ہوگئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے مشہور اجتہادات ان کے دورِ خلافت سے متعلق ہیں۔ جس میں سرِفہرست عراق اور شام کی مفتوح زمینوں کے بارے میں آپ کا اجتہاد ہے۔ شام و عراق کے بارے میں صورتِ حال یہ تھی کہ سعد بن ابی وقاص فاتحِ عراق نے آپ کو خط لکھا کہ اموال منقولہ و غیر منقولہ کے بارے میں مجاہدین کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے معاملہ شوریٰ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے یہ تھی کہ ان زمینوں کی تقسیم نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ انہیں خاصہ کے طور پر رہنا چاہیئے۔ جسے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے اور ریاست کے حدود کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اکثر صحابہ خاص طور سے عبدالرحمٰن بن عوف اور بلال وغیرہ حضرت عمرؓ کے سخت مخالف تھے۔ آخر کار حضرت عمرؓ نے معاملہ مہاجرین و انصار کے سامنے پیش کیا اور اپنے اجتہاد کے لئے سورہ انفال اور سورہ حشر کی آیتوں سے استنباط کیا۔ سورہ انفال میں کہا گیا تھا کہ "اور یاد رکھو کہ تم کو جس قدر غنیمت ملے اس میں سے پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کا رسول کا اس کے قرابت داروں کا یتیموں کا مسکینوں کا اور مسافروں کا حق ہے۔" اسی طرح سورہ حشر میں ہے "جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے واسطے رسول کے واسطے قرابت داروں یتیموں محتاجوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ ان مفلس مہاجرین کے واسطے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کے لئے جو اپنے گھروں میں اپنے ایمان پر پہلے سے جمے ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے جو بعد میں عالم وجود میں آئیں یا اسلام میں داخل ہوں ـــــــ"

حضرت عمرؓ نے اس آیت سے اجتہاد کیا اور کہا "آخر ان مسلمانوں کا کیا ہوگا جو بعد میں آئیں گے۔ وہ دیکھیں گے کہ تمام اراضی و ممالکِ مفتوحہ تقسیم کئے جا چکے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں اراضی کی تقسیم نہیں ہونی چاہیئے۔ منعِ تقسیم میں میری مصلحت یہ ہے کہ ارضِ کبریٰ میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جسے ہمیں فتح کرنا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا کہاں تک اعتراف کیجئے۔ جس نے ہمیں ان کی زمین ان کے باشندوں سمیت ہمارے قبضہ میں دے دی۔ اس فتح کے مالِ منقولہ میں سے خمس نکال کر ان ہی میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور اس خمس کو بھی اس کے مصرف پر خرچ کر دیا ہے۔ مگر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان علاقوں کی اراضی وہاں کے آتش پرست باشندوں کے ہی پاس رہنے دی جائے۔ جس میں مسلمانوں کے کئی فائدے ہیں۔ اوّل ان اراضی سے خراج وصول ہوگا۔ دوئم۔ ان کے غیر مسلم باشندوں سے جزیہ وصول ہوگا۔ سوئم۔ ان ممالک کی سرحدوں پر چوکیاں قائم

کرنے، بیت المال کو محکم کرنے اور مسلمانوں اور ان کی اولاد کی معاونت کرنے کے کام آئے گا۔ ان مصالح کی بنا پر حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کی تقسیم کے بارے میں اجتہاد کیا اور صحابہ نے اسے تسلیم کیا۔

قاضی ابو یوسف نے حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سوادِ عراق کی اراضی وغیرہ کی منع تقسیم میں قرآن مجید سے جو استدلال فرمایا تو یہ اللہ کی طرف سے ان کی بروقت معونت اور اس میں تمام مسلمانوں کی بھلائی مضمر تھی۔ اگر امیر المومنین یہ اجتہاد نہ فرماتے تو یہ تمام اموال فاتحین کے درمیان تقسیم ہو کر ختم ہو جاتے۔ جس کے نتیجہ میں نہ تو اس وقت کے مفتوحہ علاقوں کی سرحدیں محفوظ ہو سکتیں، نہ اسلامی لشکر کو جہاد کے لئے تیار کیا جا سکتا۔

حضرت عمرؓ کا دوسرا اجتہاد مالِ غنیمت اور فئے کی تقسیم کے بارے میں بہت اہم ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہ مالِ غنیمت کی مساوی تقسیم کا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس بارے میں بھی اجتہاد کیا اور مسلمانوں کی خدمات کی مناسبت سے وظائف وحصص کی تقسیم فرمائی۔ چناں چہ وظائف کی تقسیم مسابقت فی الاسلام کے اصول پر کی گئی۔ مکی دور میں اسلام لانے والے صحابہ، بدری صحابہ اور حضورؐ سے قریبی تعلق رکھنے والے صحابہ سب پر مقدم قرار پائے اور پھر بتدریج یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس طرح مالِ غنیمت میں سوار کے دو حصے اور پیادہ کا ایک حصہ مقرر کیا۔ یہ بھی حضرت عمرؓ کا اجتہاد تھا۔

خمُس کے اس حصہ کے بارے میں جس کا مصرف ذوی القربیٰ رسول صلعم تھا، حضرت عمرؓ کا اجتہاد یہ تھا کہ اس کی تقسیم کا حق خلیفہ وقت کو ہے۔ اس کے مقابلے میں حضرت علیؓ اور حضرت عباس کا یہ کہنا تھا کہ یہ ہمارا حق ہے، ہم اسے جس طرح چاہیں تقسیم کریں۔ اس سلسلے میں قاضی ابو یوسف نے جو روایتیں بیان کی ہیں۔ ایک روایت جسے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے نقل کیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے کہنے پر ان کا حق تسلیم کر لیا اور آخر تک حضرت علیؓ کو خمُس کے دو حصے ملتے رہے جسے وہ اہل بیت میں تقسیم کرتے رہے۔ [1]

حضرت عمرؓ کے اجتہادات میں ایک بہت اہم اجتہاد زکوٰۃ کے بارے میں ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کی ایک مخصوص شرح مسلمانوں کے اموال پر عائد کی تھی اور حضور نبی کریمؐ نے اپنی وفات سے قبل اپنے ایک فرمان

---

[1] فقہ عمر ص ۲۴۳۔ شاہ ولی اللہؒ

کے ذریعے اس شرح کا اعلان کر کے مقدار کا تعین کر دیا تھا۔ مگر اس فرمان اور قرآن کی ھدایات میں گھوڑوں کا کہیں ذکر نہ تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں گھوڑوں کو صرف جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب گھوڑوں کی باقاعدہ نسل کشی ہوئی اور ان کی تجارت ہونے لگی تو حضرت عمرؓ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ واجب کر دی۔ آپ کا یہ اقدام ایک خالص اجتہادی اقدام تھا اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ چوں کہ اب گھوڑے محض جنگی ضرورت نہیں ہیں بلکہ مال تجارت ہیں اور مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے اس لئے اس پر بھی زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ حضرت عمرؓ نے عبادات میں بھی اجتہاد سے کام لیا۔ رمضان میں نماز تراویح کا باجماعت التزام حضرت عمرؓ کا ہی اجتہاد ہے۔ حضرت عمرؓ سے قبل نماز تراویح انفرادی طور پر ادا ہوتی تھی۔ اور اس کی صحیح تعداد کا تعین بھی نہ کیا گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے باجماعت تراویح کا حکم دیا اور ہر محلہ میں مساجد میں اس کا اہتمام کیا گیا۔ دورِ نبویؐ میں شرابی کو حد سے حد ۴۰ کوڑے کی سزا دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو قائم رکھا مگر حضرت عمرؓ نے اجتہاد سے کام لیا اور ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی۔ اس طرح حضرت عمرؓ نے بعض مواقع پر اجتہاد سے کام لے کر قرآن وحدیث کے بعض واضح احکام کو مؤخر بھی قرار دیا۔ چناں چہ قرآن حکیم کا حکم کہ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں مگر حضرت عمرؓ نے اس زمانے میں جب کہ عرب میں قحط پڑا، یہ سزا مؤخر کر دی، جس سے ان کی اجتہادی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

دورِ خلافتِ راشدہ کے اجتہادات میں، حضرت عمرؓ کا وہ اجتہاد جس میں آپ نے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بند کر دیا، غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآنی نص کی موجودگی میں حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ یقیناً چونکا دینے والا تھا مگر چوں کہ آپ کا اجتہاد دلیلِ مستحکم کی بنیاد پر تھا، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک حکمِ قرآن کو معطل کر دیا۔ دراصل حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد کے پیچھے اصل حکمت یہ تھی کہ اب اسلام قوی ہو گیا تھا۔ اور وہ لوگ جن کی تالیفِ قلب اس خیال سے کی جاتی رہی تھی کہ وہ مملکتِ اسلام کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں، اب اسلام کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اب ان کو مالی امداد دینا غیر ضروری تھا۔ لیکن اگر کسی موقع پر دوبارہ ایسے حالات پیش آجائیں، جب اسلامی ریاست کو مؤلفۃ القلوب کو حصہ دینا پڑے تو اس کا یہ اقدام حکمِ قرآنی کی بنیاد پر جائز ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاستوں میں امام یا خلیفہ کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مصارف میں حکمتِ عملی کے تحت وہاں تک تبدیلیاں کر سکتا ہے، جہاں تک وہ قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو۔

اسی طرح مفقود الخبر شوہر کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ اجتہاد، کہ چار سال بعد وہ عورت نکاح ثانی کر سکتی ہے، واضح مصلحتوں پر مبنی تھا۔

ان اجتہادات کی روشنی میں ہمارا یہ نتیجہ نکالنا کہ دورِ خلافتِ راشدہ میں اسلام کی اجتہادی روح اپنے انتہائی کمال پر تھی، بے جا نہ ہوگا۔ اور چوں کہ دورِ خلافتِ راشدہ اور دورِ نبویؐ میں کوئی خاص بُعد نہ تھا، اس لئے صحابہ کرام کو اپنے اجتہاد کے لئے صحیح بنیاد تلاش کرنے میں کوئی دقت بھی پیش نہ آتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد کے ادوار میں اجتہاد اور اجتہادِ اجتماعی یعنی اجماع کو بھی ایک ماخذ قانون کا درجہ دیا گیا۔ چناں چہ دورِ اموی میں جس کی ابتدا امیر معاویہ کی خلافت سے ہوتی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے ہر گوشہ میں صحابہ اور تابعین پھیل جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں مختلف فقہی مدارس کا وجود عمل میں آتا ہے۔ ان فقہی مدارس کا سلسلہ ان صحابہ سے جا کر ملتا ہے جو اپنے علم و قابلیت کے لحاظ سے بجا طور پر مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں۔ خاص طور پر حضرت عبداللہ بن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور حضرت علیؓ۔ ان حضرات کے تلامذہ حضرت سعید بن مسیب، عطار بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، حسن بصری اور طاؤس بن کیسان بہت مشہور ہوئے۔

دَورِ اموی کی فقہی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ گو اس دَور میں اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا لیکن چوں کہ فقہ محض عملی مسائل تخریج کرنے کا کام نہ تھا، بلکہ نظری اور قیاسی مسائل بھی مجتہدین کے زیرِ بحث آگئے تھے، اس لئے اس دور کے مجتہدین دو گروہ میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ ایک علمائے اہلِ حدیث جو قیاس کے استعمال کو قطعی ناجائز قرار دیتے ہیں، دوسری طرف اہل الرائے جن کی نمائندگی عطار، ابراہیم نخعی اور طاؤس بن کیسان کرتے ہیں۔

بنوامیہ کے بعد دورِ عباسی میں مسلمانوں نے غیر معمولی طور پر اپنے فقہی سرمایہ کو وسعت دی اور اسی دَور میں وہ چاروں مدرسۂ فکر مشخص ہو کر ہمارے سامنے آئے جو آج امتِ مسلمہ کے پیشِ نظر انتہائی مستند اور قابلِ عمل مانے جاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے بے شمار اجتہادات ان کے شاگردانِ خاص امام ابویوسف اور امام محمد کی تالیف کردہ کتابوں میں موجود ہیں۔ امام صاحب کے اجتہاد کا طریقہ یہ تھا کہ آپ نے اپنے شاگردوں اور ہم عصروں پر مشتمل ایک مجلس مشاورت تشکیل دی تھی، جو مختلف شعبہ ہائے علم سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اصحابِ فکر اپنے اپنے مضمون میں یگانہ روزگار تھے۔ ان کے سامنے ایک ایک مسئلہ پیش کیا جاتا اور وہ اس

پر اظہارِ خیال کرتے۔ پھر امام صاحب اپنے اجتہاد سے اس مجلس کو مطلع کرتے۔ آخر میں اتفاق رائے سے یا تو امام صاحب کے اجتہاد کو منظور کر لیا جاتا یا رد کر دیا جاتا۔ امام صاحب نے اس طرح اپنے تلامذہ میں اجتہادی روح پیدا کرنے اور تخریجِ مسائل کا ملکہ پیدا کرنے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے بھی اجتہاد کو مختلف شکلوں میں زندہ رکھا اور اپنے تلامذہ کو تخریجِ مسائل کی تربیت دی۔ خاص طور پر امام شافعی نے اجتہاد کے میدان میں غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔

بنو عباس کے اوّلین سہ صد سالہ دَور میں فقہ اسلامی میں غیر معمولی اضافے ہوئے۔ لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد سے مسلمانوں کے سیاسی تنزل کے نتیجہ میں جو فکری زوال رونما ہونا شروع ہوا، اس نے آہستہ آہستہ اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے۔ اور اس دَور کے مذاہبِ اربعہ کے علمار نے بابِ اجتہاد بند کرنے کا فتویٰ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اجتہادی اہلیت کے لیے جن اعلیٰ صفات کا ہونا لازمی اور جس علمی اور فنی قابلیت کا موجود ہونا لابدی ہے، اس کا فقدان عام تھا۔ نہ عوام کا شعور اس قابل تھا کہ وہ یہ تمیز کر سکیں کہ کون تقلید کے قابل اور کس کی تقلید میں نقصان ہے۔ علمار نے محض اس خیال سے کہ بعد میں بعض جاہل اور ہوا پرست مسندِ علم پر متمکن ہو کر اسلام کے فقہی سرمایہ کو نقصان پہنچا بیٹھیں، اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشہور مصری فاضل شیخ ابوزہرہ ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

علماء نے اس دَور میں اجتہاد کا دروازہ اس لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اولاً جن علمار مجتہدین نے اپنے علم و عقل کے نور سے دنیا کو منور کیا تھا، ان کے تلامذہ اپنے شیوخ کے اقوال کو پتھر کی لکیر سمجھنے لگے تھے۔ ان گروہوں کے درمیان تعصب حد کو پہنچ چکا تھا۔ صرف اپنے اکابر کی تقلید اور ان پر اعتماد فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ ثانیاً، شروع میں خلفار کا طریقہ یہ تھا کہ عہدہ قضار پر صرف صاحبِ اجتہاد کو مقرر کرتے تھے اور مقلدین کو یہ عہدہ نہیں دیتے تھے۔ لیکن اب یہ تمیز اُٹھ گئی اور مخصوص مذاہب کے مقلد اس منصب پر فائز کیے جاتے تھے۔ ثالثاً۔ مذاہبِ اربعہ کی تدوین کے نتیجہ میں عوام نے بجائے تلاش و جستجو کے سہل انگاری سے کام لے کر ان میں سے کسی ایک مسلک کی پیروی کو اختیار کرنا شروع کیا اور اس طرح اجتہاد کے جذبے میں بہت کمی واقع ہو گئی۔

ان تمام اسباب کے نتیجہ میں وقتی طور پر اجتہادِ مطلق کا دروازہ بند ہو گیا البتہ مجتہدین المذہب اس دَور میں پیدا ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے فقہار کا اجتہاد مقید اور محدود ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے بعد تقریباً چار پانچ صدیاں اسی گومگو کے عالم میں گزریں۔ اس زمانے میں مختلف فقہاء نے بجائے نئے سرے سے تخریج مسائل کرنے کے متقدمین کے سرمائے کو مرتب کرنے، اس کے حواشی لکھنے اور اس میں بعض جزوی اصلاحات کرنے کی طرف توجہ دی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات حواشی متن سے بڑھ گئے اور مطلب خبط ہو کر رہ گیا۔ اس زمانے میں بعض کتب فتاویٰ کی تدوین کی گئی۔

لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں یہ جذبہ برابر کارفرما رہا کہ وہ ہر زمانے کے مطالبات اور ضروریات کے پیش نظر اسلام کی اصل روح کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف مسائل میں اجتہاد کریں۔ دوسری طرف بعض مسلمان حکومتوں نے بھی اس سلسلہ میں غیر معمولی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سلطنتِ عثمانیہ نے ۱۲۸۶ھ میں باقاعدہ فقہ حنفی کو ملکی قانون قرار دیا۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "المجلہ" کی تالیف اور اشاعت کا انتظام کیا۔ حکومت کا یہ اقدام اسلام کی اجتہادی روح کے عین مطابق تھا۔ المجلہ احکام العدلیہ کی اشاعت سولہ ابواب پر مشتمل تھی۔ اس میں بیشتر دیوانی معاملات بیع، اُجرت، ضمانت، انتقالِ قرض، معاھدہ، امانت، متولی، صدایا، اسراف، تغلب، ضیاع، مشترکہ ملکیت، شہادت وغیرہ سے متعلق مباحث تھے۔ المجلہ کی تدوین یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ بغداد کی تباہی، مسلمانوں کی مرکزیت کے وقتی طور پر ختم ہو جانے اور ان میں فکری اضمحلال اور تنزل آ جانے کے باوجود ہر زمانے کی مناسبت سے احکام اسلامی کی تشکیل کا جذبہ ہنوز برقرار تھا۔ یہی وہ اجتہادی روح تھی جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تین صدی پہلے ہندوستان میں فتاویٰ عالمگیری کی تدوین اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان کسی دور میں بھی محض اگلوں پر بھروسہ کر کے نہیں بیٹھے بلکہ ہر زمانے میں انہوں نے اجتہاد سے کام لے کر نئی راہیں نکالنے اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کی تکمیل ۱۰۸۱ھ بمطابق ۱۶۷۰ء میں ہوئی۔ یہ کام آٹھ سال کی محنت کے بعد انجام پایا تھا۔ فتاویٰ کا اصل نسخہ عربی میں چھ حصوں پر مشتمل تھا۔ جس کے فارسی اور اردو تراجم آج بھی ہمارے فقہی سرمایہ کی زینت ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کسی وقتی مصلحت یا شخصی خواہش کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کی ترتیب کا اصل محرک مسلمانوں کا یہ جذبہ تھا کہ اسلام ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ صرف شرعی قوانین کا اجراء کرے اور اپنے دور کے مسائل میں اجتہاد سے کام لے کر مشکلات کا حل تلاش کرے۔ عالمگیر کے بعد ہندوستان پر غیر ملکی تسلط اور مشرقِ وسطیٰ میں فرانسیسی اور برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کے

نتیجہ میں مسلمان ایک عرصہ تک اس فکری بے سروسامانی میں مبتلا رہے لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی سے دوبارہ عالمِ اسلام میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی تحریکیں اُٹھنی شروع ہوئیں چناں چہ محمد بن عبدالوہابؒ، جمال الدین افغانی اور محمد عبدہٗ کے علاوہ ہندوستان میں اقبالؒ نے جو فکری تنظیم کا کام کیا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا ہونا شروع ہوا کہ آج بھی اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ ابتدار میں عرض کیا گیا تھا، اجتہاد کا حق ہر کس وناکس کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ مخصوص شرائط ہیں۔ اگر کوئی عالمِ دین ان شرائط سے متصف ہو تو اس کو بھی اجتہاد کا حق اسی طرح حاصل ہے، جس طرح پہلے فقہار اور مجتہدین کو تھا۔

دورِ جدید میں اجتہاد کے بارے میں جن مفکرین نے اپنے نظریات پیش کیے، ان میں اقبالؒ سب سے نمایاں ہیں۔ اقبالؒ نے ایک طرف تو مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور دوسری طرف وہ اسلامی فقہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اسلامی قانون کی تعمیرِ نو کا کام شروع کیا تھا۔ اقبالؒ نے اجتہاد کی ضرورت کو بدلائل واضح کیا اور برِصغیر کے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کیا کہ آج بھی اسلامی قانون قابلِ عمل ہے اور اجتہاد کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔ اقبالؒ نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اپنے اسی خیال کا اظہار کیا تھا کہ "میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے اُصولِ قانون پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدّد ہوگا۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا۔ یہ وقت عمل کا ہے۔ کیوں کہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پہ کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

علامہ اقبالؒ نے اجتہاد کے دروازہ بند ہونے کی تین بنیادی وجوہ بتائی ہیں — اوّلاً۔ فرقہ معتزلہ کی تفرقہ آرائی کے اثرات کی روک تھام کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ثانیاً۔ مسلم سوسائٹی تصوف کے اثر و نفوذ کے نتیجہ میں سماجی تصور سے محروم ہو گئی تھی۔ اور سوسائٹی میں ذہین طبقہ کا فقدان ہو گیا تھا۔ ثالثاً۔ زوالِ بغداد نے پورے عالمِ اسلام کو متاثر کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں علمائے سلف کی تقلید کا رجحان پیدا ہوا۔

ان اسباب کا جائزہ لینے کے بعد اقبالؒ کہتے ہیں:۔

"میں نے ان اسباب کی وضاحت کی ہیں جن کی بنا پر میرے نزدیک علماء اس رائے پر پہنچے تھے۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور عالمِ اسلام کو انسانی فکر کے ہر گوشہ میں غیر معمولی ارتقاء کے اثرات سے سابقہ کرنا ہے۔ چناں چہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اب بھی اس مسلک پر قائم رہنے کی کیا وجہ ہے"۔

لیکن اقبالؒ اجتہاد کے لئے چند شرائط کی موجودگی لازمی خیال کرتے ہیں۔

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات
ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہ آباء رو کہ ایں جمعیت است
معنیٔ تقلید ضبط ملت است

لیکن رموزِ بے خودی میں اجتہاد اور تقلید کے مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے اقبالؒ نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کم نظر علماء کے اجتہاد کے مقابلہ میں تقلید محفوظ تر ہے۔ فرماتے ہیں:

ز اجتہاد عالمانِ کم نظر
اقتدار بر رفتگاں محفوظ تر

اس کے ساتھ ساتھ اقبالؒ نے عالمِ اسلام کے سوچنے سمجھنے والے طبقے سے بار بار یہ مطالبہ کیا کہ وہ جدید زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اجتہاد سے کام لے کر قانون کی تدوینِ جدید کریں۔

اقبالؒ کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اس دور میں مسلمانوں کو اجتہاد کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرایا۔ اسلامی قانون کی تدوینِ جدید کی طرف عملی قدم اٹھایا اور اس تصور کی کھلم کھلا مخالفت کی کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔